© rasailojaraid.com

حضرت یونسؑ کا ذکر قرآن مجید میں

(مولانا ابوالقاسم محمد حفظ الرحمن سیوہاروی)

(۲)

ان تصریحات کے بعد ہم یہ مناسب سمجھتے ہیں کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ان واقعات کے سلسلہ میں جن کو قرآنِ عزیز بیان کرتا ہے جو پیچیدگیاں پیدا ہوجاتی ہیں یا کردی جاتی ہیں اُن کے لئے صحیح طریق کار بیان کردیا جائے اِس مقصد کے لئے حسب ذیل چند تمہیدی اصول کا پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔

(۱) قرآنِ عزیز ہم کو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے متعلق کس عقیدہ کی تعلیم دیتا ہے اور اُن کے لئے ہمارے بنیادی عقیدہ میں کون سی جگہ ہے؟

(۲) انبیاء کے تذکرہ میں قرآنِ عزیز کی بعض آیات میں ایسا اسلوب اختیار کیا گیا ہے جو بظاہر انبیاء کی عظمتِ شان کے منافی معلوم ہوتا ہے ایسا کیوں ہے؟

(۳) قرآنِ عزیز کی کسی آیۃ میں متعدد احتمالات کی گنجائش کب پیدا ہوتی ہے؟

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ اسلام کے اہم اور غیر متبدل بنیادی عقائد میں سے ایک عقیدہ یہ ہے کہ انبیاء ورسل علیہم الصلوٰۃ والسلام کو ہم معصوم سمجھیں اور معصومیت کے معنی یہ ہیں کہ ان ہستیوں سے گناہ، یا خدائے تعالیٰ کی کسی قسم کی نافرمانی کا صدور ناممکن اور محال ہے، یہ مامور من اللہ ہوتے ہیں اور خدا کے احکام کی اطاعت ان کا مایۂ خمیر، اور اُن کی فطرت کا جزء ہے اور یہ ہر طرح کی تلویث اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نفسانی اغراض سے پاک اور مطہر ہوتے ہیں۔

اس سلسلہ میں قرآن عزیز کی تصریحات یہ ہیں۔

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ۝ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ۭ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ۝ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ۝

اور نہیں بھیجا ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول مگر اُس کو یہی حکم بھیجا کہ میرے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں سو میری بندگی کرو اور کہتے ہیں کہ رحمٰن نے بیٹا بنا لیا۔ وہ اس سے پاک ہے لیکن وہ برگزیدہ بندے ہیں، وہ اس سے بڑھ کر نہیں بول سکتے اور وہ اُسی کے حکم پر عمل کرتے ہیں۔

وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ

جو رسول کی پیروی کرتا ہے پس اُس نے یقیناً خدا کی پیروی کی

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ

اور ہم رسول کو اسی لئے بھیجتے ہیں کہ اللہ کے حکم سے اُس کی طاعت و پیروی کی جائے۔

وَمَا اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ

(انبیاء)

اور اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم، ہم نے تجھ سے پہلے نہیں بھیجا مگر مردوں کو وحی بھیجتے تھے ہم اُن کی طرف

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (النجم)

اور وہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نہیں بولتے اپنی خواہش سے یہ (قرآن) نہیں ہے مگر خدا کی وحی جو اُن کے پاس بھیجی گئی

اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ مِنْ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ وَّمِنْ ذُرِّيَّةِ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْرَاۗءِيْلَ وَمِمَّنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا (مریم)

یہ وہ لوگ ہیں جن پر انعام کیا اللہ نے پیغمبروں میں آدم کی اولاد اور اُن میں جن کو سوار کر لیا ہم نے نوح کے ساتھ اور ابراہیم کی اولاد میں اور اسرائیل کی اور اُن میں جن کو ہم نے ہدایت کی اور پسند کیا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ چند آیات ہیں جو اختصار کے طور پر یہاں نقل کی گئی ہیں ورنہ قرآن عزیز میں اس سلسلہ کی اور بھی آیات دلیل میں پیش کی جا سکتی ہیں۔

بیان کردہ تصریحات میں پہلی، دوسری اور تیسری آیات اس بارہ میں نص قطعی ہیں اور صراحت کرتی ہیں کہ پیغمبر کا کوئی قول اور کوئی عمل "من امر اللہ" اور "وحی من اللہ" سے باہر نہیں ہوتا اور اس کی زندگی ہر قسم کے گناہ کی تلویث سے پاک اور مقدس و مطہر ہوتی ہے، اور وہ دوسرے انسانوں سے الگ ایک معصوم زندگی رکھتا ہے تب ہی اس کی پیروی خدا کی پیروی شمار ہوتی ہے اور اسی لئے اُن کی بعثت کا مقصد وحید یہی یہ بنتا ہے کہ خدا کی مخلوق اُن کے حکم کے سامنے حکم خداوندی سمجھ کر سرِ تسلیم خم کردے۔ اور چوتھی، پانچویں، اور چھٹی آیات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی اس تقدیس و معصومیت کی تائید کرتی، اور یہ ثابت کرتی ہیں کہ جن انسانوں کو خدائے تعالیٰ نبوۃ و رسالۃ کے لئے چن لیتا ہے اُن کے مہتدی، مجتبیٰ اور صاحب وحی ہونے کا مقام دوسرے نیک، اور صالح انسانوں کے مقام سے جدا ایک خاص رفعت و بلندی رکھتا ہے۔

گویا پہلی سے تیسری آیات تک معصومیت انبیاء کے لئے جو قطعیت ثابت ہوتی ہے وہ اُن تمام آیات کے لئے تفسیر ہے جن میں انبیاء و رسل کی عظمت شان کو دوسرے برگزیدہ انسانوں سے ممتاز بتایا گیا ہے۔

اور اس قسم کی تمام آیات جو چوتھی، پانچویں، اور چھٹی بیان کردہ آیتوں کی طرح ہیں پہلی اور تیسری قسم کی آیتوں کی تائید، اور تقویتِ مفہوم کے لئے بیان کی گئی ہیں۔

غرض ان تصریحات سے یہ قطعی اور یقینی طور پر ثابت ہو گیا کہ انبیاء علیہم السلام کی معصومیت کا عقیدہ اسلام کا ایک بنیادی اور اساسی عقیدہ ہے۔

دوسرے سوال کے جواب کی تشریح یہ ہے کہ سابق میں معلوم ہو چکا ہے کہ انبیاء

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

علیہم السلام کے ساتھ خدائے برتر کا معاملہ عام انسانوں، بلکہ نکوکاروں، اور مقربوں، سے بھی جدا ایک خاص طریقہ کا ہے. جس طرح کائنات میں وہ نیابتِ الٰہی کا شرف رکھتے، اور تمام عالم سے افضل ترین مخلوق شمار کئے جاتے ہیں اسی طرح ان کے اس رتبۂ عالی کے پیش نظر جو خدا کی جناب میں اُن کو حاصل ہے اُن کی ذمہ داریاں بھی دنیا کی تمام مخلوق سے برتر اور نازک ہیں۔

اس بات کو اس طرح سمجھئے کہ سلاطین عالم کے دربار میں وزراء اپنے مراتبِ علیا میں سب رعایا سے ممتاز سمجھے جاتے ہیں، اور اپنے عہدہ کی ذمہ داری کے اعتبار سے اُن کا وہ مقام ہے جو دوسروں کو حاصل نہیں۔

لہٰذا امورِ مفوضہ میں گرفت، اور جوابدہی کے لحاظ سے بھی، بادشاہ اُن کے ساتھ وہ معاملہ نہیں کرتا جو عوام و خواص رعایا کے ساتھ کرتا ہے کیونکہ وہ بادشاہ کے مزاج داں حکومت کے آئین کے حال و ماہر، اور درباری قوانین کے سب سے زیادہ رازداں ہیں. پس ..... اگر کسی عام یا خاص فرد سے آئین و قوانینِ حکومت و دربار میں کسی قسم کی کوتاہی ہو جاتی، یا نافرمانی تک سرزد ہو جاتی ہے تب بھی بادشاہ یا حاکم اس پر چشم پوشی کرتا، یا بہت معمولی گرفت کر کے معاملہ کو ختم کر دیتا ہے. لیکن اس کوتاہی کا ہزارواں حصہ بھی ان وزیروں یا رازدارانِ قوانین شاہی سے سرزد ہو جاتا ہے تو وہ سخت مورد عتاب ہوتے ہیں اور اُن کی اس ادنیٰ کوتاہی کو عظیم الشان جرم کی شکل میں ظاہر کر کے اُن سے سخت سے سخت بازپرس کی جاتی ہے. اور اس قسم کا معاملہ کچھ بادشاہ و حاکم پر ہی موقوف نہیں ہے فطرتِ مستقیم اور عقلِ سلیم بھی اسی کی جانب راہنمائی کرتی ہے کہ ناواقفانِ رموزِ آئین کی کوتاہیاں جو ہر طرح نظرانداز کر دینے، اور چشم پوشی اختیار کر لینے کی مستحق ہیں واقفانِ رموز سے اگر سرزد ہوں تو موجب عتاب، اور باعث گرفت ہیں۔

اسی فطری اسلوب پر قرآنِ عزیز میں ہم خدائے برتر اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

درمیان معاملہ کی نوعیت کو" دیکھتے ہیں۔

وہ ایک طرف اُن کے عظمت و رفعت، اور عصمت و تقدیس کے لئے نصوص قطعیہ سناتا اور اُس کو اساس اسلام قرار دیتا ہے۔

اور دوسری جانب اگر اُن سے معمولی لغزش بھی سرزد ہو جاتی ہے تو سخت سے سخت لہجہ میں اُن کی گرفت کرتا ہے۔

اور چونکہ اُس نے پہلے اسلوب بیان میں اُن کے اصل رتبہ کو صاف اور واضح کر دیا ہوتا ہے۔ اس لئے دوسرے اسلوبِ بیان میں یہ خطرہ باقی ہی نہیں رہتا کہ اُن کے متعلق اُن آیات سے ہمارے جزم و اعتقاد میں تبدیلی ہو جانی چاہیئے یا ادنیٰ سا بھی شک و شبہ ہونا چاہیئے۔

کیوں؟ اس لئے کہ پہلے اسلوبِ بیان کا مقصد ہی یہ ہے کہ اُس کے ذریعہ انبیاء علیہم السلام کی حقیقی شان جو خدائے برتر کے نزدیک ہے وہ ظاہر ہو جائے۔

اور دوسرے اسلوب بیان میں اُن کی کسی لغزش پر اپنے زیادہ سے زیادہ عتاب کو اگر ظاہر کیا جائے تو اصل عقیدہ میں کسی قسم کا تزلزل نہ پیدا ہو۔

دوسرے عنوان سے اس کو یوں سمجھئے کہ پہلے اسلوب بیان میں اس بات کی وضاحت ہے کہ خدا کے ساتھ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا جو تعلق ہے اُس کے بارہ میں ہمارا کیا عقیدہ ہونا چاہیئے، اور ہم کو اُن کے ساتھ کیا معاملہ برتنا چاہیئے۔

اور دوسرے اسلوب بیان میں یہ بتایا جاتا ہے کہ ان رازداران آئین الٰہی کی کوتاہیوں پر خدا کا معاملہ ان کے ساتھ کس طرح ہوتا ہے اور احکم الحاکمین کے سامنے باایں رفعت و بلندی اور طہارت و تقدیس، اُن کی نیازمندی، اور اُن کے اعترافِ قصور کا طریقہ کیسا ہے گویا "حسنات الابرار سیاٰت المقربین" "یا نزدیکان را بیش بود حیرانی" کا ایک عجیب و غریب مظاہرہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مقصود ہوتا ہے۔

غور فرمائیے کہ حضرت آدم کو پہلے اسلوب کے مطابق سب سے بڑا اشرف ، خلافتِ الٰہیہ کا عطا فرمایا۔

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً (بقرہ) میں زمین میں اپنا نائب مقرر کرنے والا ہوں۔

لیکن جب شجرِ ممنوعہ سے حضرت آدم باز نہ رہ سکے، تو اگرچہ خود خدائے برتر نے اُن کی جانب سے صحیح معذرت فرما دی۔

وَلَقَدْ عَہِدْنَآ اِلٰٓی اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِیَ وَلَمْ نَجِدْ لَہٗ عَزْمًا — ہم نے آدم کو اس سے پہلے تاکید کر دی تھی، مگر وہ بھول گیا اور ہم نے اُس میں (اس گناہ کے لئے) ارادہ نہیں پایا۔ یا ہمت و استقلال نہ پایا۔

پھر بھی اُن کے اس عمل پر اظہارِ ناراضی کے لئے نہایت سخت تعبیر اختیار کی اور فرمایا۔

وَعَصٰٓی اٰدَمُ رَبَّہٗ فَغَوٰی — اور حکم ٹالا آدم نے اپنے رب کا اور راہ سے بھٹک گیا۔

گویا ایک اولوالعزم نبی کی نسیانی لغزش بھی حد درجہ قابلِ گرفت ہے اس لئے کہ واقفانِ رموزِ الٰہیہ سے یہ نسیان بھی کیوں ہوا۔

اسی طرح خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے رتبۂ عالی کو ملاحظہ فرمائیے۔

مَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِکُمْ وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ — محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم میں سے کسی مرد کے باپ نہیں ہیں لیکن خدا کے رسول ہیں اور نبیوں کے آخری نبی ہیں

وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ — ہم نے تجھ کو جہاں والوں کیلئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

اِنَّآ اَرْسَلْنٰکَ شَاہِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا وَّدَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا — ہم نے تجھ کو گواہ، بشیر و نذیر، اور اپنے اذن سے اللہ کی طرف بلانیوالا، اور روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ

اور ہم نے تجھ کو کل انسانوں کیلئے رسول بنا کر بھیجا ہے۔

وغیرہ وغیرہ۔

اور پھر اس واقعہ پر غور کیجئے کہ ایک مرتبہ ذات اقدس قریش کے سرداروں سے تبلیغ اسلام کے شوق میں صرف اس لئے الگ بات چیت کر رہے تھے کہ انھوں نے یہ شرط کر لی تھی کہ غرباء کے برابر بیٹھ کر ہم گفتگو نہ کریں گے۔ حسب اتفاق عبداللہ بن ام مکتومؓ ایک غریب نابینا مگر عاشق رسول صحابی وہاں آ نکلے۔ اور نابینا ہونے کی وجہ سے اصل حال سے غافل آپ کو پکارنا شروع کر دیا۔ آپ کو اس وقت یہ دخل اندازی پسند نہ آئی اور حسب عادت شریفہ محض چشم و ابرو سے ہی غصہ ظاہر ہوا زبان مبارک سے کوئی درشت کلمہ نہ فرمایا مگر اللہ تعالیٰ کو آپ کی یہ بات پسند نہ آئی اور نہایت عتاب کے ساتھ فرمایا۔

عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓى اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى

تیوری چڑھائی، اور منہ موڑا اس بات سے کہ آیا اس کے پاس نابینا اور تجھ کو کیا خبر ہے شاید کہ وہ سنورتا یا سوچتا تو کام آتا اس کے سمجھانا۔

لغت میں عبوس کے معنی کو پڑھئے اور پھر ذات اقدس کی شان کو ملاحظہ فرمائیے تو آپ کو خود حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ حب اللہ تعالیٰ کے اور انبیاء علیہم السلام کے درمیان اُن کی کسی لغزش پر (خواہ وہ کسی صورت سے بھی گناہ نہ ہو) گرفت ہوتی ہے تو حق تعالیٰ کی جانب سے کس قدر سخت تعبیر اختیار کیجاتی ہے۔

تیسرے سوال کا جواب اتنا صاف ہے کہ وہ کسی تفصیل کا محتاج نہیں یعنی اگر کسی آیت کی توضیح و تشریح بمصداق "القرآن یفسر بعضہ بعضا" قرآن کا ایک حصہ خود اپنے دوسرے حصہ کی تفسیر کر دیا کرتا ہے، "قرآن عزیز کی آیت، یا صحیح روایتِ حدیث، کے ذریعہ ہو جاتی ہو تو پھر احتمالات عقلی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور ضعیف روایات (کے پیش نظر مختلف وجوہ کے ذکر سے بجز انتشار اور اصل حقیقت کے مستور ہو جانے کے اور کوئی فائدہ نہیں ہے۔

خصوصاً انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے واقعات وقصص کے بارہ میں اس قسم کی موشگافیاں یا بے احتیاطیاں نہ صرف نامناسب بلکہ بعض مرتبہ سخت ضرر رساں ثابت ہوتی ہیں، اور متوسط و عامی مسلمانوں کے عقیدہ تک میں رخنہ انداز ثابت ہوتی ہیں اور غیر مسلم متعصبین کو حرف گیری کا سامان مہیا کرتی ہیں۔ ہاں اصل حقیقت کے منکشف اور واضح ہو جانے کے بعد دوسرے ایسے مختلف معانی و وجوہ بیان کرنا جو اسرار و حکم کی شکل میں اصل معنی کے لئے باعث تائید و تقویت ہوں نہ کہ باعث انتشار و اضمحلال تو ان کے بیان کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

اور اگر قرآن عزیز، حدیث صحیح، یا اس آیت کے بارہ میں اجماع امت کی نصوص و تصریحات موجود نہ ہوں تو پھر اصل لغت عربی کی راہنمائی میں جو احتمالات ایسے نکل سکتے ہوں کہ دوسرے مسلمہ اصولِ اسلامی پر ان سے زد نہ پڑتی ہو تو ان احتمالات کو بیان کرنا اس آیت کی تفسیر وتحقیق کے لئے بہتر ہوگا، اور وہ ہر طرح قابل تسلیم ہوں گے۔ کیونکہ قرآن عزیز عربی زبان میں نازل ہوا ہے اس لئے اس کے مفہوم و معنی سمجھنے کے لئے یہ ایسی ہی کنجی ہے جیسی کہ کلید قفل کے لئے۔

إِنَّا أَنزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ہم نے اس (قرآن) کو عربی قرآن اتارا ہے تاکہ تم سمجھو

ان تمہیدی گذارشات کے بعد اب اگر حضرت یونس (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے واقعہ میں ولن نقدر کے معنی قدرۃ سے ماخوذ تسلیم کر لئے جائیں (اگرچہ تصریحاتِ بالا کے مطابق اس کی قطعاً ضرورت باقی نہیں رہتی) تو بقول صاحب روح المعانی اس معنی میں یا مجاز اختیار کرنا پڑے گا یا استعارہ تمثیلیہ مجاز کی صورت میں معنی یہ ہوں گے۔

یونس نے سمجھا کہ ہم اس پر اپنی قدرت کا استعمال نہ کریں گے یعنی قدرت کہہ کر استعمال

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قدرت مراد لیں۔

اور تمثیل کی شکل میں اس طرح کہا جائے گا۔

حضرت یونس کے چلے جانے کا طرز ایسا تھا جیسا کوئی یہ سمجھ کر کہیں سے چلا جائے کہ ہم اس پر اپنی قدرت نہ رکھ سکیں گے اور اس کو پکڑ نہ سکیں گے۔

اگر اس دوسرے معنی کو تسلیم کرلیں تو پھر گذشتہ تمہیدی اصول میں سے دوسری اصل کے مطابق یہ کہا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر حضرت یونس کا ہجرت کر جانا باعثِ عتاب ہوا اور حق تعالیٰ نے اس سخت سے سخت تعبیر کے ساتھ اُن کے اس عمل پر گرفت فرمائی۔

چونکہ شاہ عبدالقادر صاحب جیسے مترجم قرآنِ عزیز نے اس جگہ یہی ترجمہ اختیار کیا ہے اسلئے ہم نے اس کے محل کو نقل کر دینا مناسب سمجھا ورنہ تمام محقق علماءِ تفسیر نے "لن نقدر" میں قدر کے معنی قضاء و حکم یا ضیق و تنگی ہی کے لئے ہیں اور یہی بے غل و غش صحیح اور درست ہیں۔

اس سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ حضرت یونس کا دعاء کے وقت انی کنت من الظلمین کہنا اس پر دلالت نہیں کرتا کہ انھوں نے گناہ کیا تھا۔ بلکہ ایک برگزیدہ نبی ہونیکی حیثیت سے اپنے اس طرزِ عمل کو انکساری اور نیازمندی کے طور پر جرم شمار کیا اور استغفار کیا، نیز لغت عربی میں ظلم "وضع الشئ فی غیر محلہ یعنی کسی چیز کو بے محل رکھ دینے کو کہتے ہیں۔ اور یہ جس طرح بڑے سے بڑے گناہ "شرک" پر صادق آتا ہے "ان الشرک لظلم عظیم" اسی طرح چھوٹی سے چھوٹی لغزش پر بھی صادق آتا ہے۔

عرب کا محاورہ ہے لم یظلم منہ شیئا یعنی اس میں سے ایک بھی کم نہیں ہوا۔ یہاں ظلم کے معنی کم ہونے کے ہیں۔ جواہر الحسان میں ہے۔ وقولہ انی کنت من الظلمین یرید فیما خالف فیہ من ترک مداومتہ قومہ والصبر علیہم ھذا احسن الوجوہ فاستجاب اللہ لہ ولیس فی ھذہ الکلمۃ ما یدل انہ اعترف بذنب کما اشار الیہ بعضھم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حضرت یونس بن متّٰی علیہ السلام کے واقعہ میں تیسری آیت والصّٰفّٰت کی آیات ہیں۔ اس کی ایک آیت کا تذکرہ ہم پہلے بھی کر چکے ہیں۔ ان آیات میں اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

وَاِنَّ یُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ اِذْ اَبَقَ اِلَی الْفُلْکِ الْمَشْحُوْنِ فَسَاهَمَ فَکَانَ مِنَ الْمُدْحَضِیْنَ فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ وَهُوَ مُلِیْمٌ فَلَوْلَا اَنَّهٗ کَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِیْنَ لَلَبِثَ فِیْ بَطْنِهٖ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ سَقِیْمٌ وَاَنْۢبَتْنَا عَلَیْهِ شَجَرَةً مِّنْ یَّقْطِیْنٍ وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰی مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ یَزِیْدُوْنَ فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰی حِیْنٍ ط

اور تحقیق یونس ہے رسولوں میں سے، جب بھاگ کر پہنچا اس بھری کشتی پر، پھر قرعہ ڈلوایا تو نکلا خطا وار پھر لقمہ کیا اُس کو مچھلی نے اور وہ الزام کھایا ہوا تھا، پھر اگر نہ ہوتی یہ بات کہ وہ یاد کرتا تھا پاک ذات کو، تو رہتا اُسی کے پیٹ میں جس دن تک کہ مردے زندہ ہوں، پھر ڈال دیا ہم نے اُس کو چٹیل میدان میں اور وہ بیمار تھا، اور اُگایا ہم نے اُس پر ایک درخت بیل والا، اور بھیجا اُس کو لاکھ آدمیوں پر یا اُس سے زیادہ، پھر وہ ایمان لائے پھر ہم نے فائدہ اٹھانے دیا اُن کو ایک وقت تک۔

ان آیات میں سے بعض جملوں کی تحقیق و تفسیر تو بیان ہو چکی۔ البتہ اس مقام پر صرف یہ مسئلہ قابلِ تشریح ہے کہ حضرت یونس کو مچھلی نے نگل لیا اور بعد میں اُن کو کنارہ پر اگل دیا۔

مچھلی کا حضرت یونس کو نگل لینا، اور بعد میں زندہ اگل دینا ایک اچنبھی بات معلوم ہوتی ہے اس لئے بعض ان جدید مفسروں نے جو دین و مذہب کے پردہ میں الحاد کی سمیت کو نہایت خوش اسلوبی سے پھیلانے کے عادی ہیں اس واقعہ سے انکار کرنے کی سعی کی ہے لیکن تمام روایات، اور اقوالِ مفسرین سے قطع نظر، ہم اگر قرآن عزیز کے جملہ "فالتقمہ الحوت" کی تفسیر صرف لغتِ عرب ہی سے اخذ کریں تب بھی ادنیٰ سا اشکال پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ تمام اربابِ لغت اور ائمۂ لغت کا اس پر اتفاق ہے کہ التقم کے معنی نگل لینے کے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اقرب الموارد میں ہے التقمہ۔ ابتلعہ اور اتبلع کے باب میں ہے (ابتلعہ) انخولہ من حلقومہ الی جوفہ ولم یمضغہ۔ اس نے اس کو اپنے حلقوم سے پیٹ میں اتار لیا اور چبایا نہیں۔

قاموس۔ فقہ اللغہ۔ لسان العرب۔ ان تمام سلف وخلف ائمہ لغت کی کتابوں سے بالفاق التقم کے معنی ابتلعہ کے ثابت ہیں اور ابتلاع نگلنے کی ایسی حالت کا نام ہے کہ چیز کو گلے سے نیچے اتار لیا جائے اور چبایا نہ جائے۔ صاحب اقرب الموارد نے قدیم ائمہ لغت سے ایک مثل بھی پیش کی ہے جو اہل عرب کے محاورات میں بولی جاتی ہے "لا یصلح رفیقا من لم یبتلع ریقا" وہ دوست بننے کی قابل نہیں ہے جو دوست کے تھوک کو نہ نگل جائے۔

اور کسی ایک لغت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ التقم کے معنی بغیر نگلے ہوئے فقط منہ میں لئے رہنے کے ہیں۔ لہذا کسی مدعی تفسیر قرآن عزیز کا یہ دعوی کہ لغت میں التقم کے دونوں معنی ہیں نگل لینا بھی اور فقط منہ میں لئے رہنا بھی یہ قطعاً صحیح نہیں ہے۔ بلکہ التقم جب ہی صادق آئیگا کہ اس کو گلے سے نیچے حلقوم میں اتار دے پس ایسی صورت میں یہ کہنا۔

"قرآن کریم میں حضرت یونس کے مچھلی کے پیٹ میں رہنے کے متعلق صریح لفظ نہیں ہیں"

(بیان القرآن مسٹر محمد علی لاہوری)

واقعہ کے خلاف بلکہ دیانت کے بھی خلاف ہے۔ رہا حدیث وروایت کا معاملہ سو اس سلسلہ میں امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ نے اپنی مسند میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ایک روایت بھی نقل کی ہے یہ روایت بعض محدثین کے نزدیک حسن کے درجہ کی سمجھی جاتی ہے لیکن اگر یہ روایت کسی درجہ میں بھی صحیح نہ ہو ، تب بھی اس سے نفس معاملہ کا انکار نا ممکن ہے اس لئے کہ جب لغتِ عربی " جس میں قرآن نازل ہوا ہے " اس بات کی شہادت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ے رہا ہے اور کوئی روایت اس کے خلاف موجود نہیں اور اگر ہے تو حمایت ہی میں ہے تو پھر کون سی وجہ ہے کہ ہم نفس معاملہ کا انکار محض اس لئے کر دیں کہ ہماری طبیعت اس کو اچنبھی بات سمجھ کر ماننے کے لئے ہچکچاتی ہے۔ یا خوف پیدا ہوتا ہے کہ اس کے تسلیم کر لینے سے روشن دماغ انسانوں کی فہرست سے خارج کر دئے جائیں گے۔ نیز التقم کے یہ معنی...کہ مچھلی نے اُس کو نگل لیا۔ اس کی تائید آیت کے اس جملہ سے بھی ہوتی ہے۔

فَلَوْلَا أَنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِينَ لَلَبِثَ فِي بَطْنِهِ إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ ‌ پس اگر وہ تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوتے تو قیامت تک مچھلی کے پیٹ ہی میں رہتے

اس سے زیادہ صاف اور واضح دلیل اور کن الفاظ سے ہوسکتی تھی کہ مچھلی نے یقیناً اُن کو نگل لیا اور گروہ خدائی تسبیح و تقدیس کرنے والوں میں نہ ہوتے تو کبھی اُن کو اس سے نجات نہ ملتی۔ ایسی حالت میں یہ کہنا کس قدر مضحکہ خیز ہے۔

"دوسرے اگر مچھلی کا پیٹ بھی مراد لیا جائے تو یہاں سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر وہ تسلیم کرنے والوں میں سے نہ ہوتے تو مچھلی کے پیٹ میں رہتے۔ مچھلی کے پیٹ میں جانے کا کوئی قطعی ثبوت ان الفاظ میں نہیں"

اگر یہ معنی مراد لئے جائیں جو یقیناً مراد ہیں تو پھر یہ کہنا کہ "مچھلی کے پیٹ میں جانے کا کوئی قطعی ثبوت نہیں" اس کے کیا معنی؟ اگر یہ معنی نہیں تو آخر قرآنِ عزیز کی اس آیت کے حصہ کے یہاں اور کیا معنی ہیں جو سیاق و سباق کے مطابق چسپاں ہوں۔

سب سے زیادہ مہمل یہ استبعاد ہے "کہ مچھلی قیامت تک زندہ نہیں رہ سکتی، اور اگر مچھلی کو مردہ مان کر حضرت یونس کو صحیح و سالم مانا جائے تو مردہ کے اجزاء قائم نہیں رہتے" اسلئے کہ اس فلسفیانہ موشگافی کا یہاں موقعہ ہی کیا ہے۔ یہ عرب کا اور نہ صرف عرب کا بلکہ ہر زبان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا محاورہ، اور مثل ہے کہ جب کسی شے کے متعلق یہ ظاہر کرنا ہوتا ہے کہ آخر تک یہ اسی حالت میں رہیگی تو کہا کرتے ہیں کہ "اب تو قیامت تک ایسی ہی رہیگی" تو کیا کوئی عاقل بھی اس کے معنی یہ سمجھتا ہے کہ یہ چیز فانی نہیں بلکہ اسی حال میں قیامت کے خاص دن تک باقی رہے گی۔ یا یہ سمجھتا ہے کہ اس چیز کی جو عمر و بقا بھی ہے اسی ایک حالت پر گذر جائے گی۔ لہذا یہاں بھی صرف یہ کہا گیا ہے کہ حضرت یونس کو کبھی مچھلی کے پیٹ سے نکلنا نصیب نہ ہوتا اگر وہ خدا کے تسبیح گذار نہ ہوتے۔

اسی طرح سورۂ انبیار میں فنادیٰ فی الظلمات میں یہ کہنا کہ ظلمہ سے مراد شدۃ ہے صحیح نہیں اس لئے کہ ظلمۃ اصل نسبت کے اعتبار سے تاریکی اور اندھیری کو کہتے ہیں کتب لغت میں ہے۔ (الظُلْمَۃ والظُلُمَہ) ذھاب النور، وقیل ھی عدم الضوء عما من شانہٖ ان یکون مضیئًا اور شدت کے معنی بعض مقام پر کنایۃً قرینہ سے لئے جاسکتے ہیں۔ اس لئے اگر دریا اور مچھلی کے پیٹ کی تاریکی مراد لی جائے تو نہ صرف مناسب بلکہ سیاق و سباق کے اعتبار سے بھی معنی درست اور صحیح ہیں اور بالفرض اگر شدت کے معنی ہی لئے جائیں تو بھی اصل حقیقت کے خلاف لازم نہیں آتا یعنی جب مچھلی نے بغیر چبائے نگل لیا تو دریا، اور پھر مچھلی کا پیٹ، ان شدائد کی حالت میں یونس نے خدا کو پکارا۔ بہر حال قرآن عزیز نہایت صاف اور واضح طور پر یہ ثابت کر رہا ہے کہ حضرت یونس کو اس آزمائش میں ضرور مبتلا کیا گیا اور پھر اُن کے اعتراف لغزش، اور مشغولیت تسبیح و تقدیس کے ساتھ جناب باری میں دعا کی وجہ سے اُن کو مچھلی نے کنارہ پر اُگل دیا اور وہ صحیح وسالم اس سے نجات پا گئے اور خدا اپنے برگزیدہ بندوں کے ساتھ ایسا ہی کیا کرتا ہے۔

حضرت یونس علیہ الصلوٰۃ والسلام کے واقعہ سے متعلق پانچویں آیت سورہ ن والقلم میں مذکور ہے۔ اس آیت کا مقصد یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرکے کہا گیا ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہ تم کو دشمنوں کی ایذا پر صبر کرنا چاہئے اور حضرت یونس کی طرح جلد بازی اور بے صبری نہ دکھانا چاہئے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوتِ إِذْ نَادَىٰ وَهُوَ مَكْظُومٌ لَوْلَا أَنْ تَدَارَكَهُ نِعْمَةٌ مِنْ رَبِّهِ لَنُبِذَ بِالْعَرَاءِ وَهُوَ مَذْمُومٌ فَاجْتَبَاهُ رَبُّهُ فَجَعَلَهُ مِنَ الصَّالِحِينَ ٥

اب تو استقلال سے راہ دیکھتا رہ اپنے رب کے حکم کی اور مت ہو صاحب حوت جیسا۔ جب پکارا اُس نے اور وہ رنج میں بھر رہا تھا۔ اگر نہ سنبھالتا اُس کو تیرے رب کا احسان تو پھینکا گیا ہی تھا چٹیل میدان میں الزام کھا کر پھر نوازا اُس کو اس کے رب نے پھر کر دیا اُس کو برگزیدہ لوگوں میں۔

رہا یہ کہنا کہ اس میں اختلاف ہے کہ کون سے دریا کا واقعہ ہے اور اگر فرات کا واقعہ ہے تو اُس میں اتنی بڑی مچھلیاں کہاں؟ سو یہ بھی تجربات ہے اس لئے کہ جہاں تک جائے وقوع کا سوال ہے تو محققین اس پر متفق ہیں کہ یہ فرات کا واقعہ ہے اور صاحب روح المعانی اپنا چشم دید واقعہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے خود فرات میں ایسی ایسی مچھلیاں دیکھی ہیں جو عظیم الشان جثہ رکھتی تھیں۔ یعنی انسان کو لقمہ بنا سکتی تھیں۔

اس تمام تحقیق و تفصیل کی اگر تحلیل کی جائے تو اس سے حسب ذیل نتائج اخذ ہوتے ہیں۔

(۱) حضرت یونس خدائے برتر کے برگزیدہ انبیاء میں سے ایک نبی و پیغمبر تھے۔

(۲) حضرت یونس نے اپنی قوم کو ڈرایا تھا کہ اگر وہ ایمان نہ لائیں گے تو خدا کے عذاب میں گرفتار ہو جائیں گے۔ قوم نے اول نہ مانا مگر حضرت یونس کے ترک وطن کے بعد ایمان قبول کر لیا اور اس وجہ سے عذاب الٰہی ٹل گیا۔

(۳) یہ صرف قوم یونس ہی کی خصوصیت تھی کہ وہ تمام کی تمام قوم مشرف بہ ایمان ہوگئی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۴) حضرت یونس کا ترک وطن کر جانا اگرچہ گناہ نہ تھا مگر نبی کی ہجرت اذن الٰہی کے بغیر نہیں ہو سکتی اس لئے جلد بازی تھی۔

(۵) خدائے تعالیٰ انبیاء کی معمولی لغزش پر بھی نہایت سختی سے باز پرس کرتا اور اس کو بہت بڑے جریمہ سے تعبیر کرتا ہے۔

(۶) حضرت یونس کے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آیا اور مچھلی کے پیٹ میں مقید کر دئے گئے۔ حضرت یونس نے اعتراف جرم کیا، دعا مانگی اور خدا نے ان کو معاف کر دیا اور برگزیدہ انسانوں (نبیوں) کے زمرہ میں شامل رکھا۔

(۷) حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے بتایا گیا کہ تمہاری قوم پر بھی عذاب عام نہ آئے گا اور آخر میں وہ ایمان لے آئیگی۔

(۸) ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا کہ تم جلد بازی سے کام نہ لینا جس طرح حضرت یونس نے ہجرت کرنے میں لیا۔ بلکہ اولوالعزم رسولوں کی طرح خدا کے حکم کے منتظر رہتے ہوئے صبر کو ہاتھ سے نہ دینا یہی وہ امور ہیں جو قرآن عزیز میں حضرت یونس کے واقعہ کے متعلق پانچ سورتوں میں صاف صاف مذکور ہیں اور جن میں باقی احتمالات، وتاویلات رکیکہ و باطلہ کی قطعاً گنجائش نہیں۔

اب ہم اپنے اس مضمون کو صرف دو جزوی اور ضمنی امور کی تشریح کے بعد، جو اسی سلسلہ سے متعلق ہیں، ختم کرتے ہیں۔ امید ہے کہ انشاء اللہ ناظرین کو اس سے فائدہ پہنچے گا اور انبیاء علیہم السلام کے قصص و وقائع میں جو گنجلکیں نظر آتی ہیں ان میں سے سلسلہ کی اس دوسری کڑی سے وہ تسلی وتشفی حاصل کریں گے۔

(۱) سورۂ انبیاء میں کہا گیا ہے۔

فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ سَقِيْمٌ — سو ہم نے اس کو چٹیل میدان میں ڈالدیا اور وہ بیمار تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور سورۂ ن والقلم میں ہے۔

لَوْلَا أَنْ تَدَارَكَهُ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهِ لَنُبِذَ بِالْعَرَاءِ وَهُوَ مَذْمُومٌ — اگر اس کو نہ سنبھالتا تیرے رب کا احسان تو پھینکا گیا ہی تھا چٹیل میدان میں الزام کھا کر۔

پہلی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یونس کو چٹیل میدان میں مچھلی کے پیٹ سے نکال کر ڈال دیا گیا۔ اور دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر خدا کا احسان شامل حال نہ ہوتا تو چٹیل میدان میں ملزم بنا کر ڈال دیا جاتا تو ایک جگہ اثبات اور دوسری جگہ اس کی نفی معلوم ہوتی ہے اور یہ تضاد ہے جو قرآن عزیز میں نہ ہونا چاہیے۔

صاحب روح المعانی نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ دوسرے واقعہ میں نبذ بالعراء کیساتھ وھو ملیم کی قید ہے اور پہلے واقعہ میں فقط نبذ بالعراء کا ثبوت ہے لہذا مطلب یہ ہے کہ دریا کے کنارے کھلے میدان میں وہ ڈالے تو ضرور گئے۔ لیکن خدا کے فضل واحسان کے ساتھ نہ کہ ملزم ومجرم بنا کر ذلت ورسوائی کے ساتھ۔ اسلئے پہلی آیت میں اصل واقعہ کا ذکر ہے اور دوسری آیت میں اس خصوصی صفت کا انکار ہے جس کا شبہ قاری کے دل میں پیدا ہو سکتا تھا۔

(۲) حضرت یونس مچھلی کے پیٹ میں کتنی مدت رہے؟ اس کے بارہ میں مختلف اقوال منقول ہیں زیادہ رجحان یہ ہے کہ تین روز یا ایک ساعت۔ باقی قرآن عزیز سے صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ حضرت یونس مچھلی کے پیٹ میں کچھ مدت رہے۔ کتنی مدت رہے؟ اس سے ساکت ہے لہذا بیان کردہ اقوال میں سے جس قول کو قرینہ کے مناسب سمجھا جائے اختیار کیا جائے ورنہ بغیر تعینِ مقدار نفس واقعہ پر ایمان لانا کافی ہے۔

وللہ الحمد وبہ نستعین

© rasailojaraid.com